Date of Publication : 02-11-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 03-04 Nov. 2014 R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 November 2014
Issue: 42, Vol.:73

۸تا۱۴رنومبر۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر:۴۲، جلد نمبر:۷۳

ہندستان کی تین عظیم شخصیتوں علامہ اقبال کی یوم ولادت ۹رنومبر ہے تو مولانا ابوالکلام آزاد کی ۱۱رنومبر اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی یوم پیدائش ۱۴رنومبر ہے۔ اس مناسبت سے ان کی یاد میں مشہور و ممتاز اہل قلم جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب اسیم کاویانی اور ڈاکٹر مظفر حسین سید کے مضامین اس شمارے (۱۵ تا ۲۱رنومبر) میں شائع کیے جارہے ہیں۔ ان مضامین میں ان شخصیتوں کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ (ادارہ)

اقبال کی شاعری

شمس الرحمٰن فاروقی
C-29، ہیسٹنگس روڈ
الہ آباد-211001

میرے والد مرحوم کی توجہ اور کوشش کی بدولت مجھے بچپن ہی میں اقبال کے کلام اور پیغام دونوں سے کچھ آشنائی ہوگئی تھی۔ اقبال کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ تو میں شاید اب بھی نہیں کرسکتا، لیکن اقبال سے پوری پوری محبت رکھنے کا دعویٰ میں البتہ کرسکتا ہوں۔ اور اس محبت کو پیدا کرنے، اسے پروان چڑھانے اور قائم رکھنے کے وسائل مہیا کرنے میں میرے شوق و ذوق کا جو کچھ حصہ ہوسکتا ہے، اس سے زیادہ حصہ میرے والد مرحوم کی محنتوں اور شفقتوں کا ہے اور میں ان کے اس احسان پر ہمیشہ فخر کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ بچے کو اس کا اہل سمجھا۔ اقبال سے میری محبت عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اور اگرچہ میں نے ان پر اتنا کچھ لکھا نہیں جتنا کہ چاہتا تھا، اس وقت میری جھولی میں 'اقبالیات' کے نام سے یہی آٹھ اردو مضامین اور اتنے ہی انگریزی مضامین ہیں، لیکن میری زندگی کا بڑا حصہ اس طرح کی ادبی فضا تیار کرنے میں صرف ہوا جس میں اقبال سے محبت کرنے کے لیے مسلمان، یا فلسفی یا سیاسی کارکن ہونا ضروری نہ ہو لیکن ادب شناس اور ادب دوست ہونا، بالخصوص اردو فارسی ادب کا مزاج داں اور مزاج شناس ہونا ضروری ہو۔

اقبال پر میں نے ہمیشہ اپنا کچھ اسی طرح کا حق سمجھا جس طرح کا حق اپنے والد پر سمجھتا تھا کہ وہ مشکل کے وقت میری دستگیری کریں گے، کوئی مسئلہ پوچھوں گا تو صحیح حل بتائیں گے، بھٹک جاؤں گا تو رہنمائی کریں گے۔ اقبال نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں ورڈزورتھ (William Wordsworth) کی شاعری نے انھیں دہریہ ہونے سے بچالیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اقبال نے وقتاً فوقتاً مجھے یاس اور بے مصرفی کے قعروں میں غرق ہونے سے بچالیا اور اس کی وجہ ان کا 'پیغام' نہیں بلکہ ان کی شاعری تھی:

وہ حرف راز جو سکھلا گیا ہے مجھ کو جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفی سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

ان اشعار کے 'معنی' سے مجھے غرض ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ میں ان کی 'شرعی' یا 'غیر شرعی' تعبیر میں ہر دم دیوانہ رہوں۔ میں انھیں جتنی بار پڑھتا ہوں مجھے یہ اشعار ہر بار ایک نئی لذت، ایک نیا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔ ہر بار یہ اشعار اپنی روانی، موسیقیت، بلند لیکن دردمندی سے معمور آہنگ، نئے اور نامانوس لفظوں کو انجماد کی سطح سے اٹھا کر زبان اور اعصاب کی سطح پر لے آنے کی قوت کے باعث مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں خود کو زندہ سمجھوں اور اس قوت مند، تقریباً الہامی زبان کا زندہ شریک سمجھوں جس میں اس طرح کے شعر ممکن ہوسکتے ہیں۔ لڑکپن میں میرے پاس تھا 'خضر راہ' ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں تھی۔ سمجھوں یا نہ سمجھوں، لیکن یہ شعر میری روح میں آج بھی ایک خوشگوار تلاطم، ایک لذت انگیز سنسنی پیدا کر دیتے ہیں:

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے؟
یہ تکاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

جب 'ضرب کلیم' میرے ہاتھ لگی تو اس وقت تک 'ضرب کلیم' کی کچھ نظموں سے متفرق طور پر میں واقف ہو چکا تھا، خاص کر 'شعاع امید' اور کچھ مختصر منظومات۔ پوری کتاب میں نے 1950 یا 1951 میں دیکھی، اور سب سے پہلے جس چیز نے مجھے متوجہ کیا وہ اس کا ذیلی عنوان تھا "اعلان جنگ، دور حاضر کے خلاف"۔ بات میری سمجھ میں ٹھیک سے نہ آئی۔ اپنے باپ سے میں اس قدر بے تکلف نہ تھا کہ ان سے پوچھتا۔ استادوں کی طرف نظر نہ گئی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا، کیوں کہ اس اعلان جنگ کے جو معنی میں نے بالآخر سمجھے وہ شاید میرے استادوں کے لیے قابل قبول نہ ہوتے۔ ہائی اسکول کے بعد اردو میرے پاس نہ تھی، لیکن اسی زمانے میں یا اس کے کچھ ہی بعد، مجھے اقبال کے بارے میں مجنوں گورکھپوری کی کتاب 'اقبال، اجمالی تبصرہ' کی خبر لگی۔ مجھے معلوم ہوا کہ مجنوں صاحب نے اقبال کے ساتھ کچھ زیادتیاں کی ہیں۔ یہ گورکھپور تھا، جہاں مجنوں صاحب کے علم اور ادبی مرتبے کا ڈنکا بجتا تھا اور جہاں کے پڑھے لکھے حلقوں میں انھیں صرف 'مجنوں صاحب' کہا جاتا تھا، 'مجنوں گورکھپوری' نہیں۔ یعنی ان حلقوں میں مجنوں صاحب کا نام بالکل گھریلو نام تھا۔ فراق صاحب اور مجنوں صاحب دو نامور فرزند گورکھپور کے تھے اور ہر شخص ان سے محبت کرتا تھا۔ میں اس وقت اکثر کے پہلے یا دوسرے سال میں تھا، مجھے ان معاملات کی زیادہ سمجھ نہ تھی، لیکن جب میں نے مجنوں صاحب کی کتاب کسی طرح حاصل کر کے پڑھی تو میں مجنوں صاحب کی نکتہ چینیوں سے کچھ مطمئن نہ ہوا اور اقبال سے میری محبت حسب سابق باقی رہی۔

'ضرب کلیم' نے مجھے یہ بات بھی سمجھائی کہ 'اعلان جنگ' کے لیے ضروری نہیں کہ شاعر جھنڈا لے کر نعرے لگائے یا بندوق لے کر محاذ جنگ قائم کرے۔ شاعر کے لیے سب سے اچھی جنگ یہی ہے کہ وہ شاعر اچھا ہو اور اپنے خیالات کو اس طرح ادا کرے کہ جس چیز کو وہ ناپسند کرتا ہو اس کے لیے ہمارے دل میں بھی ناپسندیدگی پیدا کرے، لیکن ہماری گردن قلم کر نہیں، اپنی فنی لیاقت کے ذریعے۔ لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا، سوا اس کے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا لیکن مغربی

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

پہلی قسط

جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد

سوانح و افکار کی چند جھلکیاں

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیپٹن اپارٹمنٹ، بیلویدر روڈ، مجگاؤں، ممبئی 400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

نہر سعادت علی خاں اور نہر زبیدہ:

جیسا کہ پنڈت نہرو نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے، اُن کے آبا و اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ مغلیہ سلطنت کے عہدِ زوال میں جب دلی کے تخت پر فرخ سیر حکمراں تھا، اُن کے خاندان کے ایک بزرگ راج کول جو فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، فرخ سیر کے بلاوے پر دلی چلے آئے تھے۔ یہاں انھیں نہر سعادت علی خاں کے کنارے ایک جاگیر عطا ہوئی تھی، اسی مناسبت سے وہ پہلے 'کول نہرو' پھر صرف 'نہرو' کہلانے لگے اور یہی لفظ اُن کے خاندان کی عرفیت بن گیا۔

بقول مولانا آزاد اُن کے آبا و اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندستان وارد ہوئے تھے۔ مولانا نے اکبر اور شاہ جہاں کے زمانے میں اپنے بلند مرتبت بزرگوں کے بلند مناصب کا ذکر 'تذکرہ' میں کیا ہے۔ غدر کے بعد کے ابتر حالات میں مولانا کے والد مولانا خیرالدین جو ایک جید عالم اور شیخ طریقت تھے، ہجرت کر کے مکے چلے گئے تھے۔ وہاں کے ایک عالم شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی سے اُن کی شادی ہوگئی اور وہ وہیں آباد ہوگئے۔ مکے ہی میں 1888 میں مولانا آزاد کا جنم ہوا تھا۔

دھیان دیجیے تو 'مغل رہا' کے علاوہ 'نہر' سے بھی مولانا آزاد کے خاندان کا ایک خاص تعلق نظر آتا ہے، جو عمل میں آیا ہوتا تو گویا مولانا کے علم و کمال سے ہندستان محروم ہی رہ جاتا۔ بروایت ملیح آبادی، مولانا خیرالدین نے اپنے زمانۂ حجاز میں دیکھا کہ 'نہر زبیدہ' خشک پڑی ہے اور وہاں لوگ پیاس سے مر رہے ہیں۔ برائے نام پانی ہے بھی تو حکومت کے عمال نے لوٹ مچا رکھی ہے۔ مولانا خیرالدین نے نہر زبیدہ کی مرمت کی تحریک چلائی اور برصغیر کے امرا، والیانِ ریاست اور مصر و شام و ترکی کے متمول و مخیر حضرات سے چندہ اکٹھا کیا اور چند یورپین اور مسلم انجینئروں کی مدد سے نہر کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لیے بیس لاکھ روپیوں کا فنڈ جمع ہوگیا تھا، شومیِ قسمت سے وہ شریفِ مکہ نے اپنی دسترس میں لے لیا۔ اُس نے حجاز کے مفتی اور شیخ حرم سے ساز باز کر کے تقریباً نصف رقم خرد برد کر لی۔ مولانا خیرالدین نے کسی نہ کسی طرح نہر کی مرمت مکمل کی، پر جب انھوں نے شریف مکہ کے کرتوت طشت از بام کرنے کی کوشش کی تو وہ دشمنی پر کمربستہ ہوگیا۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شریف مکہ کی دشمنی کی وجہ سے مولانا کے والد کو کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور پھر وہاں کے سیاسی حالات بھی بگڑ چلے تھے۔ قصہ مختصر اس کے بعد شریف مکہ سرطان کا شکار ہوکر مرا اور مولانا خیرالدین ایک حادثے میں ران کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے بغرضِ علاج اہلِ خانہ کے ساتھ کلکتے چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

نہرو اور آزاد دونوں ہی اپنے اپنے خاندان سے آسودہ حال تھے، فرق اتنا تھا کہ مولانا آزاد خالص مذہبی ماحول اور مشرقی بالخصوص دینی علوم سے وابستہ رہے، جب کہ نہرو کا گھرانا جدید دنیا سے ہم آہنگ ہو چکا تھا اور اُن کے لیے مغربی درس گاہوں کے در کھلے ہوئے تھے۔

متاہلانہ زندگی

مولانا آزاد کا نکاح زلیخا بیگم سے کم سنی ہی میں ہوگیا تھا اور جواہر لعل نے جب کملا کو جیون ساتھی بنایا تو اُن کی عمر ستائیس برس کی تھی۔ زلیخا بیگم اور کملا نہرو دونوں ہی قدامت پسند خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور گھریلو مذہبی تعلیم کے علاوہ وہ دونوں واجبی طور پر اردو زبان جانتی تھیں۔

دونوں وفا شعاروں نے اپنے اپنے شوہر کے آزادیِ وطن و بہبودیِ قوم کے عزائم کے لیے اپنا سکھ چین قربان کر دیا اور اُن دونوں کی بیاہتا زندگی کا بڑا حصہ مجبوری و کلفت کی نذر ہوگیا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی چھتیس برس کی رہی اور کملا نہرو نے جواہر لعل کو تقریباً بیس برس کے بعد داغِ مفارقت دے دیا تھا۔ دونوں ہی خواتین ایک مدت تک حبِ دق سے نبرد آزما رہیں اور آخر اسی مرض نے انھیں موت سے ہم کنار کیا۔ جب زلیخا بیگم نے کلکتے میں آخری سانس لی تو مولانا آزاد احمد نگر کے قلعے میں نظر بند تھے اور جس وقت کملا نہرو نے لوزان (سوئزر لینڈ) کے ایک سینی ٹوریم میں دم توڑا تو اتفاق سے نہرو بھی اُس وقت وہاں نہ تھے۔

کملا نہرو نے گاندھی جی کی سودیشی اور عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیا تھا اور وہ دو بار جیل بھی گئی تھیں۔ زلیخا بیگم اگرچہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں، لیکن 1942 میں جب کلکتے کی ایک عدالت نے مولانا کو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا تھا تو انھوں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا تھا، جس سے اُن کے جذبۂ حریت، وطنی تحریک سے وابستگی اور مولانا کے برداشت کیے گئے شدائد پر اُن کے تفاخر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ 'مولانا کی قومی خدمات کے صلے میں ایک سال کی انتہائی کم سزا دے کر اُن کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے۔ وہ اس سے پیشتر بھی اُن کی چار سالہ نظر بندی کی آزمائش میں پوری اُتر چکی ہیں اور آیندہ بھی پوری اُتریں گی۔' اس کے علاوہ مولانا کی سزایابی کی مدت تک وہ خلافت کمیٹی کے کاموں کو اپنے بھائی کی مدد سے انجام دیتی رہیں۔

نہ کسی پہ کوئی زخم عیاں
نہ کسی کو فکر رفو کی ہے

رام گوپال نے اپنے ایک آرٹیکل Trails of Nehru میں جواہر لعل نہرو پر چلائے گئے مقدمات کی تفصیل پیش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پنڈت نہرو نے ہماری آزادی کے رہ نماؤں میں سب سے زیادہ مقدمات کا سامنا کیا تھا اور سب سے زیادہ مدت یعنی اپنی زندگی کے تقریباً چودہ قیمتی سال جیلوں میں گزارے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق اُن کی زندگی کے ہر ساڑھے پانچ دنوں میں سے ایک دن جیل کی نذر ہوا تھا۔ جواہر لعل نے اپنے کسی بھی مقدمے میں اُن پر عائد الزامات پر بھی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اکثر وہ کوئی نہ کوئی ایسا بیان داغ دیتے تھے جو اُن پر عائد الزامات سے بھی شدید ثابت ہوتا تھا۔ ایک بار کلکتے کی چیف پریسی ڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پبلک پراسیکیوٹر جواہر لعل کے بیان کے درمیان چیخ اُٹھا تھا:

''کیا ملزم یہاں ایک اور باغیانہ تقریر کا خواہاں ہے، سر!''

مولانا آزاد نے آزادیِ وطن کی راہ میں تقریباً دس برس قید و بند کی سختیاں جھیلی تھیں۔ اُن کی زندگی کا ہر ساتواں دن جیل میں گزرا تھا، لیکن جہاں کہیں انھوں نے اپنی حکایتِ زنداں لکھی ہے، اُن کی تحریر کی شوخی و سرمستی کا یہ عالم ہے کہ وہ سرکار کے جبر کے گرفتار سے زیادہ طرۂ حریت کی زلف کے گرفتار نظر آتے ہیں، گویا

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد

نہرو ہی کی طرح انھوں نے بھی ایک بار کلکتے کی پریسی ڈنسی جیل کے احاطے میں جاری عدالت میں مجسٹریٹ کو اپنے تاریخی بیان میں بر ملا کے الفاظ میں یوں مخاطب کیا تھا:

''... زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جاسکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمھارے قلم میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔''

پڑھا ریل میں لکھا جیل میں:

کسی نے پنڈت نہرو کے تعلق سے بجا طور پر کہا ہے کہ انھوں نے پڑھا ریل میں لکھا جیل میں۔ خود نہرو نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا ہے: ''میرا مطالعہ زیادہ تر گاڑیوں کے اندر ہو جاتا ہے، جب میں اس وسیع ملک میں ادھر سے اُدھر سفر کرتا ہوں...''

وہ عام طور پر ٹرین کے سفر میں ایک بکس بھر کر کتابیں لے جایا کرتے تھے جو اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھیں جتنی کہ وہ پڑھ پاتے تھے۔ کرایے کی کفایت اور عام لوگوں سے جڑے رہنے کے خیال سے وہ عموماً انٹر یا تیسرے درجے میں سفر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انٹر یا تیسرے درجے کتابوں کے مطالعہ یا کسی اور کام کے لیے مناسب جگہ تو نہیں، لیکن ریل کے دیگر مسافر اپنی محبت اور ریلوے کے حکام اپنی مہربانی سے انھیں مناسب جگہ پیش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے ریل کے اسفار میں اپنے لکھنے کے تجربے اور اس میں پیش آئی کٹھنائی کا دل چسپ پیرایے میں یوں ذکر کیا ہے:

''... میں حالتِ سفر میں خاص طور پر کانگریس کے متعلق خط لکھنے کا بہت کام کیا کرتا تھا۔ مختلف ریلوے لائنوں پر بار بار کے تجربے نے مجھ میں یہ اندازہ لگانے کی اہلیت پیدا کر دی تھی کہ تحریر کی آسانی کے لحاظ سے کون سی لائن بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سلسلے میں پہلی جگہ ایسٹ انڈین ریلوے کو دی۔ نارتھ ویسٹرن بھی بری نہیں، لیکن جی آئی پی تو یقیناً بری ہے۔ وہ انسان کے سارے جسم کو ہلا دیتی ہے۔''

ہم دیکھتے ہیں کہ نہرو کی بہترین

تصانیف جیل ہی میں لکھی گئی تھیں۔ اُن کی آپ بیتی کا پہلا نقش جو 1936 میں Towards Freedom کے نام سے شائع ہوا تھا، قید خانے ہی میں تحریر ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ہونہار بیٹی پریہ درشنی اندرا کے نام جو دل چسپ اور نئے مفصل خط لکھے تھے اور جو Glimpses of World History کے نام سے مشہور ہیں، وہ 1930-1933 کے درمیان نینی، بریلی اور دہرہ دون کی جیلوں میں لکھے گئے تھے۔ انھوں نے برصغیر کی عظمت پارینہ کی جو داستان Discovery of India میں بیان کی ہے، وہ احمد نگر میں اُن کے 1942-1945 کے زمانہ اسیری ہی کی دین ہے۔ ان کتابوں میں ان کا تاریخی شعور، تخلیقی وفور اور حسن اسلوب درجۂ کمال پر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے احمد نگر ہی کی جیل میں کئی سو صفحات کی وہ ڈائری بھی لکھی تھی جو Selected works of Jawahar Lal Nehru کی تیرھویں جلد میں شامل ہے۔

رو میں ہے رخش عمر... زنداں میں تلاش بہار کرتے رہے

قلعہ احمد نگر کی بیرکوں میں نہرو اور آزاد کے کمرے ملے ہوئے تھے۔ درمیان میں صرف ایک سات فٹ کی پتلی دیوار حائل تھی۔ یہیں مولانا آزاد کی جولانیٔ فکر اور شوق اظہار نے اپنے صدیق مکرم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کے نام وہ کارخطوط رقم کیے تھے، جن کا مجموعہ غبار خاطر کے نام سے مشہور ہے۔ اسی زنداں میں انھوں نے اپنے عظیم الشان علمی و فکری کارنامے 'ترجمان القرآن' (جلد اول، ساہتیہ اکاڈمی اڈیشن) پر آخری بار نظر ثانی کی تھی۔ یہاں یہ بھی بتا تا چلوں کہ قرآن کے ترجمے اور تفسیر کا جو عظیم الشان منصوبہ انھوں نے 'البلاغ' کے زمانہ اشاعت میں شروع کیا تھا، ان افکار عالیہ کا بیشتر حصہ جیل کی چار دیواری ہی میں تحریر ہوا اور ڈھایا جاتا رہا۔ پہلی بار ان کے مسودات رانچی کی نظر بندی کے وقت جولائی 1916 میں وہاں کے حکام نے اپنے قبضے میں لے لیے تھے اور مولانا اُن کی بازیابی میں ناکام رہے تھے۔ اُن کی شب و روز کی محنتوں کے نتیجے میں ترجمان کے از سر نو تحریر کردہ اور اضافہ شدہ اجزا کی ناکوں کا سرمایہ دسمبر 1921 میں کلکتے میں ان کی دوسری گرفتاری کے موقع پر وہاں کے ارباب اختیار کے تسلط میں چلا گیا تھا۔ بڑی کوششوں سے پندرہ ماہ بعد جب وہ انھیں لوٹایا گیا تو:

پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

کا سا معاملہ تھا۔ وہ آدھا ادھورا مواد اوراق پریشاں کی صورت میں اُن کے صبر و شکیب کی آزمائش بن گیا تھا۔ جہاں ہم، وہ پھر اپنے جگر لخت لخت کو جمع کرتے رہے تھے۔

رانچی کی نظر بندی کا زمانہ تین سال نو ماہ پر محیط ہے۔ وہیں پر انھوں نے سیرت شاہ ولی اللہ، تفسیر البیان، تاریخ معتزلہ، دیوان غالب پر تبصرہ اور دیگر کئی عنوانات پر اپنے لکھے ہوئے مسودات کا ذکر کیا ہے جو یا تو وہیں ضائع ہو گئے یا اُن کی آئندہ کی سیاسی مصروفیتوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

سچ پوچھیے تو اپنی مصروف زندگی میں مولانا کے لیے زنداں کی خلوتوں میں علائق دنیوی سے بے نیاز ہو کر اپنے فکر و تخیل کے نتائج کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی مسرت اتنی بڑی نعمت تھی کہ انھیں (شاعرانہ زبان میں) کبھی بھی گراں باریٔ زنجیر کا شاکی نہیں پایا گیا، بلکہ علی پور کلکتے کی جیل ہی میں انھوں نے جو عدالتی بیان (قول فیصل) لکھ کر پیش کیا تھا، اُس کی روشنی میں تو وہ شوق سزا میں بقول غالب جلاد سے بھی دو قدم آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خود کردہ را علاجے نیست:

ہندستان کی آزادی کے بعد پنڈت نہرو ملک کے وزیر اعظم بنے اور مولانا آزاد نے وزیر تعلیم کا منصب سنبھالا۔ اس کے بعد اُن دونوں ہی کی تصنیفی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر رہ گئیں۔

بہ روایت جگن ناتھ آزاد ایک بار ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے سپرو ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ وہاں ممتاز اہل قلم اور جوش و فراق جیسے شعرا رونق محفل بنے ہوئے تھے اور باذوق سامعین سے ہال بھرا ہوا تھا۔ مولانا آزاد اور جواہر لعل ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ جب جواہر لعل نہرو سے خطاب کرنے کی گزارش کی گئی تو انھوں نے اپنی تقریر میں حسرت بھرے لہجے میں کہا، "ایک وقت تھا کہ میں آپ ہی کی برادری کا فرد تھا اور بڑے ذوق و شوق سے لکھا کرتا تھا۔ اب تو زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ پڑھنے لکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

اگلی صف میں سے اُٹھ کر جوش نے پنڈت جی سے کہا، "آپ نے اور مولانا نے خود ہی اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ آپ کو خدا نے علم و ادب کو گراں قدر بنانے کے لیے پیدا کیا تھا، لیکن آپ نے خود ہی وزارتوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا۔ مثل مشہور ہے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔" جوش کی بات سن کر نہ صرف سامعین خندہ بار ہو اٹھے بلکہ پنڈت جی اور مولانا بھی متبسم نظر آئے۔

رتو راج

نوشت و خواند میں دونوں ہی مشاہیر کا جی ایسا لگتا تھا کہ اس راہ میں کبھی موسم کی سختیاں آڑے آئیں نہ قید و بند کی صعوبتیں مزاحم ہوئیں۔ شمبھر ناتھ پانڈے نے اپنی ایک تحریر میں ذکر کیا ہے کہ 1938 میں الہ آباد میں جب مئی، جون کی سخت گرمیوں کے دن تھے، وہ نہرو جی کی ایما پر اُن کے یہاں جا کر ہندی کے خطوں کے جواب لکھا کرتے تھے۔ نہرو انھیں روز دس پندرہ خطوں کا جواب ڈکٹیٹ کرا دیا کرتے تھے۔ اپنے کوئی دس دنوں کے کام میں انھوں نے مشاہدہ کیا کہ اُن دنوں میں جب کہ پارہ (115 سے 118 ڈگری تک!) چڑھا ہوتا تھا، نہرو صرف ہاف پینٹ پہنے، ننگے بدن اپنی لائبریری کے اوپری کمرے میں مصروف نظر آتے تھے جب کہ پچھم کے کھلے دروازے سے لو کے تھپیڑے چل رہے ہوتے تھے۔ آخر ایک دن پانڈے جی نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ کیا انھیں لگے بدن جھلس جانے کا ڈر نہیں؟

پنڈت نہرو نے انھیں ہنس کر بتایا:

"قدرت نے تین موسم بنائے ہیں: جاڑا، گرمی اور برسات۔ اگر ہم تینوں موسموں کو برداشت کر لیں تو جسم کی برداشت کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے بیسوں برس سے کوئی دوا نہیں کھائی، جب کہ میرے دوست بابو شری پرکاش روز طرح طرح کی گولیاں کھاتے ہیں۔ وہ اپنے بند کمرے میں موسموں کو گھسنے ہی نہیں دیتے جب کہ میں ہر موسم کا دل کھول کر استقبال کرتا ہوں... اگر ہم قدرت سے محبت کرتے ہیں تو قدرت بھی ہماری حفاظت کرتی ہے۔"

پانڈے جی کو یاد آیا کہ گرو دیو رابندر ناتھ جواہر لعل کو رتو راج کہا کرتے تھے۔

مولانا نے 'غبار خاطر' میں لکھا ہے کہ موسم کی خنکی اُن کے لیے زندگی کا اصل سرمایہ ہے اور گرمی کی شدت ہی مسلسل کیوں نہ ہو، انھیں بہت جلد پریشان کر دیتی ہے۔ ان کے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور یوں تھا:

"...جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب درجۂ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو، آتش دان میں اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں۔"

قلعہ احمد نگر کی حراست کے دور میں ایک بار دسمبر میں کڑاکے کا جاڑا پڑا۔ پارہ چالیس درجے سے بھی نیچے اتر گیا۔ نکلنے سے گرم کپڑے آنے پڑے تھے، لیکن مولانا نے انھیں چھوا بھی نہیں، اس ڈر سے کہ گرم کپڑے پہنیں گے تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا۔

فکر و نظر کی ترجیحیں:

نہرو اور آزاد نے اگرچہ غلام ہندستان کی سنگلاخ سیاست کا میدان جہاد زندگانی کے لیے منتخب کیا تھا اور آزاد ہندستان کے سیاسی تشخص اور دستوری خدوخال متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، لیکن اُن کا ادبی و فکری سرمایہ بھی اتنا گراں قدر ہے کہ اہل نظر کا ایک طبقہ اُن کی دانش وری کے اس سرمایے کو زیادہ اہم گردانتا ہے، جب کہ دوسرا طبقہ فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ وہ زیادہ بلند پایہ ادیب تھے یا سیاسی!

نہرو کے یہاں سائنسی ذہن، مورخانہ نظر، سماجی شعور اور سادہ مگر دل نواز اسلوب پایا جاتا ہے، جب کہ مولانا کے یہاں قاموسی ذہن، حکیمانہ نظر، فلسفیانہ شعور اور مرصع و مسجع اسلوب۔ اس کے ساتھ ہی دونوں مدبروں کی تحریروں میں انسان دوستی، رواداری، روشن فکری، قومی یک جہتی اور مستقبل بینی کے مشترکہ عناصر سونے چاندی کی طرح جاری و ساری ملتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں یہاں پر اُن کے اشتراک فکر و نظر کے صرف چند ہی اشارے کروں گا۔

مولانا نے 'قول فیصل' میں حریت فکر اور اظہار حق کی مثال میں یونان کے فلسفی سقراط، اٹلی کے عقل صداقت برونو، گلیلیو اور حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا تھا۔ نہرو بھی اندرا کے نام لکھے اپنے ایک خط میں اُن کے ہم آواز نظر آتے ہیں، جہاں انھوں نے کلیسا کے جنونیوں کے ہاتھوں گلیلیو کے مورد ستم بننے اور برونو کو زندہ جلائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ نہرو شہنشاہ اشوک اور شہنشاہ اکبر کی وسیع نظری اور کشادہ فکری کے فریفتہ تھے، لکھتے ہیں:

"1556 تا 1605 تک یعنی پچاس برس تک... اکبر کا نام ہندستان کی تاریخ میں جگمگا رہا ہے۔ وہ اکثر باتوں میں اشوک کی یاد دلاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ عیسا سے تین سو سال قبل ایک بودھ شہنشاہ اور عیسا کے بعد سولھویں صدی کا ایک مسلم شہنشاہ دونوں ایک ہی طرح سے اور تقریباً ایک ہی آواز میں بول رہے تھے۔ تعجب نہیں کہ یہ آواز خود ہندستان کی آواز ہو، جو اپنے دو سپوتوں کی زبان میں بول رہی ہو!"

نہرو کے ہم مسلک آزاد سرمد شہید کی وسیع مشربی کے گن گاتے ہیں اور اسی تعلق سے داراشکوہ کے قائل نظر آتے ہیں۔ اورنگ زیب نے بھی نصف صدی تک حکومت کی تھی جسے مولانا کا قلم نہیں سراہتا، بس اس کے زہد آبادی سے عشق کی داستان سناتے ہوئے وہ آوز ہو جاتا ہے کہ وہ زاہد خشک اپنے بیٹے کے کسی کونے میں دل بھی رکھتا تھا!

تاریخ کی روایات و نتائج کو دونوں ہی دانش وروں نے مستقبل کی راہیں روشن کرنے کا ذریعہ بنایا تھا نہ کہ ماضی کے اندھیروں سے چپٹے رہنے کا۔ نہرو نے اپنی وصیت میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد طفلی ہی سے الہ آباد میں گنگا اور جمنا کی روانی کا نظارہ کیا تھا۔ بالخصوص گنگا کو انھوں نے ہندستان کی صدیوں پرانی تہذیب و تمدن کی علامت اور اُس کی فتح و شکست، رنج و راحت اور اُمیدوں اور اندیشوں کے ایک ورثے کے روپ میں دیکھا ہے۔ ایک طرح سے انھوں نے اسے ماضی کے منبع سے مستقبل کی نامعلوم منزل کی طرف رواں ایک ندی بتایا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ گنگا اور جمنا کے زرخیز میدانوں ہی میں انھوں نے اپنی زندگی اور عمل کی راہیں متعین کی تھیں۔

مولانا آزاد نے آزادی کے بعد کی اپنی جامع مسجد کی تقریر میں ہجرت کے مقدس نام پر فرار کی زندگی اختیار کرنے والے مسلمانوں کو جمنا کے حوالے سے بڑی دردمندی سے یاد دلایا تھا کہ ان کے بزرگوں نے ترک و ایران سے آ کر یہیں جمنا کے کنارے ڈیرے ڈالے تھے۔ اور پھر ان اولوالعزم ڈیرے والوں کے ہاتھوں میں حکومت کی ڈور آ گئی تو انھوں نے صدیوں تک فرماں روائی کی تھی۔ (باقی آئندہ)

●❖●

اردو دُنیا

اردو کے فروغ کے لیے
مشترکہ طور پر کام کرنے کا اساتذہ نے حلف لیا

فیروزآباد، یوپی (۱۵؍اکتوبر)۔ غالب ایجوکیشن لائبریری کے زیر اہتمام شہر کے تعلیمی اسکولوں میں مضمون کے طور پر اردو پڑھانے والے اساتذہ کی ایک نشست کا انعقاد الہدیٰ ماڈل اسکول میں کیا گیا جس میں مشترکہ طور پر اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے کا حلف لیا گیا۔ لائبریری کے مہتمم اور کاشی اردو مرکز کے صدر میاں بصیر الدین نے بتایا کہ اس نشست کا مقصد ابتدائی سطح پر طلبہ میں اردو سے رغبت پیدا کرنے کے طریقوں پر تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ نشست کی صدارت کرتے ہوئے ظہیر الدین نے کہا کہ ہم سب کو یہ ذریعۂ معاش اردو زبان کی بدولت حاصل ہوا ہے، اس لیے ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ ہم اس کا حق ادا کریں یعنی پرائمری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو اردو سکھا کر اردو داں افراد کی نئی نسل تیار کریں اور اگر ابتدائی سطحوں پر ہم اپنا کام پوری ایمانداری سے نہیں کریں گے تو اردو زبان کی تدریس متاثر ہوگی اور بچوں کا زبان داں بننا تو درکنار، وہ حرف شناس بھی نہیں بن پائیں گے۔ اردو ان کے لیے ایک اجنبی، غیر مانوس اور مشکل زبان بن کر رہ جائے گی۔ وہ نہ صرف اپنی لسانی اور تہذیبی شناخت کھو بیٹھیں گے بلکہ اردو زبان کی شیرینی، لطافت اور دلکشی کے ساتھ ساتھ اس میں موجود وسیع تر علمی، ادبی اور مذہبی سرمایے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے اپنی ذمہ داری کو پوری ایمانداری کے ساتھ انجام دیا تو یقینی طور پر اردو فروغ پائے گی۔ حافظ دلشاد نے اس موقع پر کہا کہ میں اپنی پوری ٹیم کی جانب سے یقین دلاتا ہوں کہ ہم اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں گے کیوں کہ مادری زبان کی ترقی میں جب تک ہم بیدار و فاعل نہیں ہوں گے، بہتر نتائج سامنے نہیں آسکیں گے۔ آج ضرورت ہے نئی نسل میں مادری زبان سے رغبت پیدا کرنے کی، اس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا احساس دلانے کی۔ علی اردو کی سرگرم اور پرخلوص شراکت سے ہی اردو زبان کی تدریس کے مسائل بہ آسانی حل ہو سکتے ہیں۔ سلیم صدیقی نے کہا کہ ابتدائی درجات کی تدریس سب سے مشکل، اہم اور نازک فریضہ ہے۔

دیگر مضامین کی طرح ہی اردو کی تدریس کے لیے بھی زبان دانی، ادب شناسی، متعلقہ مضمون میں مہارت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی، قومی یکجہتی اور اعلا اخلاقی اقدار کے فروغ جیسے اصول اپنانا لازمی ہے۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ طلبہ میں اور خود ہمارے اندر بھی مطالعے کا ذوق پیدا ہو، کیوں کہ الیکٹرانک میڈیا کے بڑھتے اثرات کے سبب اس میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ایم جی ڈگری کالج میں صدر شعبۂ اردو فرح تبسم نے کہا کہ ہماری قدیم روایتی تعلیم کا طریقہ کار معلم مرکوز تھا لیکن جدید تعلیمی نظام میں استاد یا معلم کی حیثیت تسہیل کار یعنی آسانی پیدا کرنے والے کی ہے، اس لیے اس کے مزاج اور رویے میں طلبہ کے تئیں شفقت، اپنائیت، معاونت اور ہمدردی کی خوبیوں کا ہونا لازمی ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو میڈیم امیدواروں کے لیے خصوصی ڈی ایس سی کا مطالبہ

نظام آباد (۱۲؍اکتوبر)۔ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس ایسوسی ایشن نظام آباد یونٹ کے صدر محمد اسحاق حسین اور سکریٹری محمد خالد الدین نے اپنے مشترکہ صحافتی بیان میں کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی زبردست قلت ہے۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اردو میڈیم اساتذہ کے تقرر کے لیے فوری اسپیشل ڈی ایس سی منعقد کیا جائے۔ کئی اسکولس ایسے ہیں جہاں ایک ٹیچر بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے طلبہ پرائیویٹ اسکولوں کا رخ کر رہے ہیں بالخصوص اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون واری ٹیچرس نہیں ہیں۔ ضلع پریشد ہائی اسکول ڈچپلی میں 25 سال سے سماجی علم پڑھانے والا ٹیچر نہیں ہے۔ ضلع پریشد ہائی اسکول مالکور، پرکٹ، درپلی، اوت پلی میں فزیکل سائنس کے مستقل ٹیچر نہیں ہیں۔ نئی درسی کتب تو آگئی ہیں لیکن پڑھانے والے مستقل ٹیچرس نہیں ہیں جس سے طلبہ کو دشواری پیش آرہی ہے۔ ۱۳؍اکتوبر سے SA 1 امتحانات شروع ہونے والے ہیں طلبہ کس طرح امتحانات دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ضلع نظام آباد میں اردو میڈیم کی جملہ 593 مخلوعہ اساتذہ کی اسامیوں کو منظور کرتے ہوئے فوری Special DSC کا انعقاد عمل میں لایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ دسویں جماعت کے مضمون تلگو میں 35 نشانات کے لزوم کو برخاست کیا جائے، سابقہ کی طرح 20 نشانات برقرار رکھے جائیں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

سرکاری اداروں سے اردو کے سائن بورڈ غائب

باغپت، یوپی (۱۱؍اکتوبر)۔ صوبائی سرکار کی طرف سے سرکاری دفاتر اور دیگر اداروں میں نیم پلیٹ اور سائن بورڈ اردو میں بھی لگانے کے احکام جاری کیے گئے تھے۔ ایک سال کے دوران دوسری مرتبہ یہ ہدایت جاری ہوئی ہے لیکن فی الحال ان پر کہیں بھی عمل نہیں ہو رہا ہے۔ سرکاری احکام صرف فائلوں میں ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ضلع بھر کے زیادہ تر سرکاری دفاتر اور اداروں میں کہیں بھی اردو کے سائن بورڈ یا نیم پلیٹ نظر نہیں آتے ہیں جب کہ چند دفاتر کے باہر نہایت غلط ڈھنگ سے اردو میں نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے جسے دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ انتہائی بوجھل دل سے اردو کے نام پر صرف خانہ پری کی گئی ہے۔ اردو داں طبقے نے ضلع انتظامیہ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ سرکاری احکام کے مطابق یوپی کی دوسری سرکاری زبان ہونے کے ناطے کسی اردو داں سے ہی صحیح اردو میں سائن بورڈ اور نیم پلیٹ سبھی دفاتر میں لگوائے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں دو لاکھ سے زائد اسامیاں خالی

دیوبند، یوپی (۱۷؍اکتوبر)۔ مفت اور بچوں کی ضروری تعلیم کا حق قانون (آر ٹی ای) نافذ ہونے کے بعد بھی سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی کمی ہے، جب کہ شکشا پریشد کے پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں دو لاکھ سے زائد جگہیں خالی ہیں۔ اس صورت حال سے سب سے زیادہ نقصان دیہی علاقوں کے طلبہ کا ہو رہا ہے کیوں کہ شہر یا قصبے کی بہ نسبت وہاں تعلیمی سرگرمیاں اور بھی زیادہ متاثر ہو رہی ہیں۔ اتر پردیش میں سال 2011 میں آر ٹی ای نافذ ہونے کے بعد اس وقت کی مایاوتی حکومت نے پہلی مرتبہ نومبر 2011 میں ٹی ای ٹی کا انعقاد کرایا تھا جس کے بعد 72,825 اساتذہ کی تقرریوں کا عمل شروع ہوا تھا جس کی کاؤنسلنگ تاحال جاری ہے۔ اقتدار میں آنے کے بعد سماج وادی پارٹی نے اس وقت کے چیف سکریٹری جاوید عثمانی کی صدارت میں ایک ہائی پاور کمیٹی تشکیل دی تھی جس کے بعد عثمانی کمیٹی نے سال 2012 میں اپنی رپورٹ میں تقریباً دو لاکھ 70 ہزار نئے اساتذہ کی تقرری کیے جانے کی سفارش کی تھی۔ رپورٹ میں یہ رائے پیش کی گئی تھی کہ ایک لاکھ 70 ہزار جگہوں پر شکشا متروں کا تقرر کر دیا جائے اور ایک لاکھ اساتذہ کی راست طور پر تقرری کی جائے۔ آر ٹی ای کے مطابق اساتذہ کی خالی جگہوں پر مارچ 2015 تک لازمی طور پر تقرریاں کی جانی ہیں۔ گزشتہ دو سالوں میں تقریباً 76 ہزار اساتذہ کی تقرریاں ہو چکی ہیں لیکن اس دوران تقریباً 24 ہزار اساتذہ ریٹائرڈ بھی ہوئے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں ٹریننگ لینے والے 90 ہزار شکشا متروں کی ماہ دسمبر 2014 تک تقرری کیے جانے کی تجویز ہے۔ پرائمری اسکولوں میں 72 ہزار سے زائد اور جونیئر ہائی اسکولوں میں 29 ہزار معاون اساتذہ کی کاؤنسلنگ مرحلہ وار جاری ہے، لیکن یہ اساتذہ اسکولوں میں کب سے تدریسی کام شروع کریں گے فی الحال اس کا جواب مشکل ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ پورے صوبے میں دو لاکھ سے زائد جگہیں خالی ہیں جن کو لازمی طور پر تقرریوں کے ذریعے پر کیا جانا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

دیہی علاقوں میں اردو اساتذہ کی سخت ضرورت

کھورا بازار، بستی (۱۹؍اکتوبر)۔ اردو اکادمی اور دوسری تنظیمیں اردو زبان کی ترقی اور فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں، پھر بھی ہماری زبان اردو کے استعمال کا صحیح اور عملی حق اس وقت تک ادا نہیں ہوگا جب تک کہ ہم اس زبان کو شہروں و قصبوں کے ساتھ سب سے چھوٹی اکائی گاؤں تک نہ پہنچا دیں، کیوں کہ جب ہم دیہی علاقوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں کے بچے اردو تعلیم کا نظم نہ ہونے سے اردو کی تعلیم سے محروم ہیں۔ ایک جائزہ کے مطابق بہادر پور بلاک میں پرائمری اسکولوں کی کل تعداد تقریباً 144 ہے اور مڈل کلاس کے سرکاری اسکول کی تعداد بھی تقریباً 55 ہے۔ اگر ہم پرائمری اور مڈل اسکولوں میں اردو ٹیچر کا موازنہ کریں تو 78 اردو ٹیچرز کی اس بلاک میں سخت ضرورت ہے۔ واضح ہو کہ اردو ٹیچرز کی عدم فراہمی کے سبب ہزاروں طلبہ و طالبات اردو زبان کے پڑھنے لکھنے سے محروم ہیں۔ اطلاع کے مطابق مسلم علاقے میں چل رہے اسکولوں میں پڑھنے والے اردو طلبہ و طالبات کی تعداد ایک سروے کے مطابق 35 سے 40 فیصد ہے۔ ایسے میں اردو ٹیچرز کی عدم موجودگی کی بنا پر بچوں کا اپنا بنیادی حق اپنی زبان کی تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ ریاستی حکومت نے اردو ٹیچروں کی تقرری کا وعدہ تو کیا تھا لیکن وہ وعدہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ایسی صورت حال میں جہاں اردو پڑھنے والوں کو حکومت ٹیچر مہیا نہ کر سکے تو محبان اردو اور دیگر اردو تنظیموں کا اہم رول کیا ہونا چاہیے، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ نئی نسل کے بچے اردو زبان سے دور ہو جائیں گے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ضلع انتظامیہ اردو اخبارات اور صحافیوں کو نظر انداز کر رہی ہے

شاہجہاں پور (۱۹؍اکتوبر)۔ اتر پردیش میں پہلے ہی اردو زبان کو صوبے کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو چکا ہے، یہاں کی ضلع انتظامیہ نے اردو زبان کے اخبارات اور ان کے صحافیوں کو پوری طرح نظر انداز کر کے اپنی متعصب ذہنیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ۱۷؍اکتوبر کو صوبے کے وزیر اعلا اکھلیش یادو کی یہاں آمد تھی۔ ایسے میں جب کہ اردو اخبار کے صحافیوں کو پاس جاری نہیں کیے گئے ہیں تو اردو صحافی کس طرح وزیر اعلا کا پروگرام کوریج کریں گے۔

(انقلاب۔ دہلی)

فارسی اور عربی کو برقرار رکھنے کے لیے
حکومتِ تلنگانہ کا جی او جاری

حیدرآباد (۱۳راکتوبر)۔ حکومتِ تلنگانہ نے نویں اور دسویں جماعت میں زیر تعلیم طلبہ کو ایک سے زائد زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے لیے جامع لسانی مضامین (عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت) کے طریقہ امتحان کو رائج کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت نے ایس ایس سی امتحانات میں جامع لسانی مضامین کو روشناس کرواتے ہوئے علی الترتیب 80 اور 20 نشانات مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ ۹راگست ۲۰۱۴ء کو حکومت تلنگانہ کے محکمہ تعلیمات نے ایک جی او جاری کرتے ہوئے اس کے پیرا نمبر 3 میں بتایا تھا کہ کمپوزٹ کورس عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انجمن طلبہ و طالبات نے دارالسلام پہنچ کر بیرسٹر اسدالدین اویسی (رکن پارلیمنٹ) سے ملاقات کی تھی اور اس مسئلے کو پیش کیا جس پر موصوف نے سید احمد پاشاہ قادری، ممتاز احمد خاں اور جعفر حسین معراج کو ہدایت دی تھی کہ وہ فوراً محکمۂ تعلیمات کے ارباب مجاز کو مکتوب روانہ کریں اور کمپوزٹ کورس کی برقراری کے لیے اقدام کا مطالبہ کریں، جس پر ان قائدین نے محکمہ کو مکتوب روانہ کیا اور حکومت نے اس کا نوٹ لیتے ہوئے محکمۂ تعلیمات کو ماضی کے طریقۂ کار پر عمل کی ہدایت دی جس کے بعد محکمے کی جانب سے ۱۰راکتوبر کو ایک نیا جی او جاری کیا گیا جس میں کمپوزٹ کورس کو جوں کا توں رہنے کی ہدایت دی گئی۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

دفاتر میں اردو مترجمین کے ساتھ ناانصافی
میٹنگ میں اعلا حکام سے ملاقات کر کے حالات سے واقف کرانے کا فیصلہ

لکھنؤ (۱۳راکتوبر)۔ اترپردیش اردو مترجمین راجیہ کرمچاری سنگھ کی ایک میٹنگ تنظیم کے ریاستی صدر شفیق الرحمن کی صدارت میں انہی کی قیام گاہ پر ہوئی۔ تنظیم کے ریاستی جنرل سکریٹری حیدر رضا نے کہا کہ بیشتر اضلاع سے یہ شکایتیں موصول ہو رہی ہیں کہ مختلف سطح پر دفاتر میں جان بوجھ کر افسران اور کلرک اردو مترجمین کو پریشان کر رہے ہیں، ڈی پی سی میں خامیاں نکال کر فائدہ نہ دیے جانے کے لیے ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ صدر جلسہ نے کہا کہ اس شکایت کے سلسلے میں تنظیم کے ضلعی صدر اور سکریٹری کو ہدایت جاری کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے اپنے ضلع میں محکمہ جاتی سطح پر جائزہ لیں اور اپنی رپورٹ ریاستی کمیٹی کو 15 دن کے اندر پیش کریں۔ انھوں نے بتایا کہ محکمۂ ترقیات، امداد باہمی، ریونیو، گنا اور روزگار محکمہ میں ابھی تک اے سی پی کا فائدہ نہ دیے جانے کی اطلاع موصول ہو رہی ہے۔ ریاستی صدر نے کہا کہ اردو مترجمین کی مشکلات کو دور کرنے کے سلسلے میں ریاستی کمیٹی مرحلہ وار کارروائی کا منصوبہ تیار کر رہی ہے۔ پہلے مرحلے میں محکمہ جاتی وزیر اور پرنسپل سکریٹری سے ملاقات کر کے افسران اور ملازمین کی زیادتیوں سے واقف کرایا جائے گا۔ دوسرے مرحلے میں چیف سکریٹری کو واقف کراتے ہوئے اس کے ازالے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اس موقعے پر سینئر نائب صدر عتیق احمد، سلمان اختر اور غفران فاروقی سمیت بڑی تعداد میں اردو مترجمین شامل تھے۔

(اردو ایکشن، بھوپال)

اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن محبوب نگر کے قائدین کی
ڈپٹی چیف منسٹر محمد محمود علی سے ملاقات

محبوب نگر، تلنگانہ۔ پروگریسیو اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی ضلعی شاخ محبوب نگر کے صدر محمد معظم علی، جنرل سکریٹری خواجہ قطب الدین و دیگر اراکین نے ڈپٹی چیف منسٹر محمد محمود علی سے ملاقات کر کے ریاست تلنگانہ میں اردو اساتذہ کی نمائندگی کرنے کے لیے ایک اردو ایم ایل سی کے لیے احکام جاری کرنے، ہر ڈسٹرکٹ لیول پر ایک اردو آفیسر کا تقرر کرنے، اردو مدارس میں نئے پوسٹ ایس جی ٹی، ایس اے، پی ای ٹی اور پی ٹی کی منظوری عمل میں لانے، تمام ریاست تلنگانہ میں تلگو میڈیم اسکولوں میں ایک اردو ٹیچر کی پوسٹ کی منظوری کرنے اور ہر ضلع میں ایک اردو ٹیچرس بھون کا قیام عمل میں لانے کا مطالبہ کیا۔ ڈپٹی چیف منسٹر محمد محمود علی نے یقین دلایا کہ وہ اردو مدارس اور اردو اساتذہ کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس موقعے پر اے جیتندر ریڈی (رکن پارلیمنٹ)، این سرینواس گوڑ (رکن اسمبلی)، محمد محسن خاں، محمد امتیاز اسحاق، محمد محمود، محمد سلام خاں، انصاری بن احمد باوزیر، ایوب انصاری، نورالحسن اور خواجہ معین الدین کے علاوہ دوسرے اراکین نے شرکت کی۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم جونیئر کالج کرنول کا جائزہ

کرنول، آندھراپردیش (۱۳رستمبر)۔ رکن پارلیمنٹ حلقہ کرنول محترمہ بٹا رینوکا اور رکن اسمبلی حلقہ کرنول جناب ایس وی موہن ریڈی نے نو قائم شدہ گورنمنٹ اردو میڈیم جونیئر کالج کا دورہ کرتے ہوئے تمام درکار ضروریات کا جائزہ لیا۔ صدر انجمن ترقی اردو کرنول کریم اللہ خاں نے مذکورہ قائدین کا استقبال کیا اور کالج میں زیر تعلیم طلبہ و طالبات کو درپیش مسائل سے واقف کرواتے ہوئے کہا کہ کالج کے قیام کو تین ماہ مکمل ہو چکے ہیں، لیکن اب تک تدریسی عملہ، پانی، فرنیچر و دیگر بنیادی سہولیات کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ تین ماہ سے خدمات انجام دینے والے لیکچررس کو کوئی معاوضہ نہیں دیا جا رہا ہے، جس پر رکن پارلیمنٹ نے طلبہ اور سرپرستوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسلم طلبہ کی تعلیمی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ کالج میں درپیش مسائل کی یکسوئی کے لیے پوری کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ ایم پی فنڈ کے تحت فرنیچر اور کمپیوٹر فراہم کیا جائے گا۔ رکن اسمبلی مسٹر ایس وی موہن ریڈی نے کہا کہ کالج میں درکار تدریسی عملے کی تکمیل فراہم کرنے پر عملے کی منظوری کی کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے برموقع میونسپل کمشنر سے فون کر کے کالج کو فوری پینے کا پانی فراہم کرنے کی خواہش کی، جس پر انھوں نے عنقریب پائپ لائن نصب کرنے کا وعدہ کیا۔ کالج کے طلبہ و طالبات نے مہمانوں سے ملاقات کرتے ہوئے کالج میں درکار ضروریات کو پورا کرنے کی درخواست کی۔ اس موقعے پر مسلم قائدین جناب عبدالحمید، جناب عبدالحفیظ خاں اور جناب نور احمد کے علاوہ تدریسی و غیر تدریسی عملہ بھی شریک رہا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

رفتید ولے نہ از دل ما

لکھنؤ۔ اردو کے مشہور و ممتاز صحافی جناب نافع قدوائی کا طویل علالت کے بعد ۱۲راکتوبر ۲۰۱۴ء کو ڈاکٹر لوہیا اسپتال گومتی نگر (لکھنؤ) میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 58 برس تھی۔ ۱۵راکتوبر کو بعد نماز ظہر عیش باغ کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے محمد عاصم اور محمد عامر ہیں۔ وہ ہیپاٹائٹس بی اور بخار کے مرض میں مبتلا تھے۔ نافع قدوائی مشہور صحافی، انشاپرداز و خاکہ نگار مولانا عبدالماجد دریابادی کے نواسے تھے۔ نافع قدوائی نے اپنی صحافتی خدمات کا آغاز 'قومی آواز' سے کیا تھا بعد میں وہ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے وابستہ ہو گئے، برسوں 'راشٹریہ سہارا' میں خدمات انجام دینے کے بعد خرابیٔ صحت کے سبب انھوں نے مستقل رخصت حاصل کر لی۔ آزاد صحافی کے طور پر لکھنؤ کے علاوہ دہلی، ممبئی سمیت جنوبی ہند کے اخبارات کے لیے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ نہایت شریف، منکسر اور مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

o

علی گڑھ۔ ممتاز ادیب جناب سہیل احمد قمر جائسی کا انتقال ہو گیا۔ ان دنوں وہ اپنے بیٹے (جاوید رضوی) کے ساتھ علی گڑھ میں قیام پذیر تھے اور یہیں ۱۸راکتوبر ۲۰۱۴ء کو انھوں نے آخری سانس لی۔ تدفین ۱۹راکتوبر کی صبح جائس کے ان کے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ سہیل احمد قمر جائسی 1926 میں جائس کے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی اور پھر وہ الٰہ آباد آ گئے، یہاں جمنا مشن اور ایونگ کرسچین کالج میں تحصیل علم کے بعد ۱۹۴۹ء میں انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ قمر جائسی کو طالب علمی کے زمانے سے ہی ادب سے دلچسپی تھی۔ معروف جاسوسی ناول نگار ابن صفی ان کے ہم جماعت اور ہم خیال دوست تھے۔ دونوں کی ادبی زندگی کا آغاز ماہنامہ 'نکہت' (الٰہ آباد) سے ہوا۔ ابن صفی کے ساتھ ساتھ قمر جائسی نے بھی 'نکہت' کے لیے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین اور افسانے لکھے، بعد میں انھوں نے جاسوسی ناول بھی لکھے جو 'نرالا جاسوس' (الٰہ آباد) سے شائع ہوئے۔ نصف صدی سے زیادہ طویل اپنے تخلیقی سفر میں انھوں نے سیکڑوں افسانے، مزاحیہ و طنزیہ مضامین اور کئی ناول یادگار چھوڑے ہیں۔ طنز و مزاح کے امتزاج نے ان کی تحریروں میں دلکشی پیدا کر دی ہے۔ 'اجڑے گھر کا چراغ' ان کا اہم ناول ہے جو ۲۰۰۸ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

اردو والوں کے لیے تلنگانہ میں روزگار اور تعلیم کے مواقع

حیدرآباد۔ قانون حق تعلیم ایکٹ کے تحت پرائیویٹ اسکولوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ کم سے کم 25 فیصد طلبہ کو مفت تعلیم فراہم کریں۔ ان خیالات کا اظہار محمد عبدالغنی (سپرنٹنڈنٹ ریجنل جوائنٹ ڈائرکٹر آف اسکولس حیدرآباد) نے کیا۔ نمائندہ 'اعتماد' کے ساتھ ایک خاص ملاقات کے دوران انھوں نے کہا کہ جو تعلیمی ادارے آر ٹی ای پر عمل آوری سے انکار کر رہے ہیں حکومت ان کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔ زبان دوم کے حوالے سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ریاست تلنگانہ میں اردو کو زبان دوم کا درجہ دیا گیا جب کہ تلگو بہ دستور سرکاری زبان ہے، اس لیے جو طلبہ زبان دوم کے طور پر اردو اختیار کیے ہیں ان کے لیے تلنگانہ ریاست میں روزگار کے علاوہ اعلا تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کے لیے بہترین مواقع دستیاب ہیں۔ جناب عبدالغنی نے کہا کہ تلنگانہ ریاست میں اردو دوسری سرکاری زبان ہونے کے ناطے جب بھی اساتذہ کے تقرر ہوں گے تو اردو میڈیم کے طلبہ کو ہی ترجیح دی جائے گی۔ اعلا تعلیم کے میدان میں زبان دوم اردو پڑھنے والے طلبہ ٹی ٹی سی کے علاوہ بی ایڈ جیسے پروفیشنل کورسوں میں آسانی سے داخلہ لے سکتے ہیں۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

◆◆◆

بقیہ: اقبال کی شاعری

صفحہ ایک سے آگے

سیاست کے ہاتھ میں بالکل بے اثر تھا۔ اقبال کی نظم 'جمعیت اقوام' میں جو طنز اور مغربی اقوام اور سرمایہ دار فرنگی نظام کے خلاف جو احتقار ہے اس نے مجھے خود اقبال کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور مغربی سیاست کے بارے میں بھی بصیرت عطا کی:

جمعیت اقوام

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

یہ الفاظ آج بھی اتنے ہی سچے ہیں جتنے اس وقت تھے جب اقبال نے انھیں قلمبند کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ نام بدل گیا ہے۔ آج کی یو این او بھی امریکہ کے ہاتھ میں اسی طرح کٹھ پتلی ہے جس طرح کل کی جمعیت اقوام (League of Nations) مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں موم کی ناک جیسی تھی۔ فلسطین کے معاملے میں اسرائیل کے خلاف معمولی سے معمولی تجویز بھی ناکام ہو جاتی ہے کیوں کہ امریکہ اپنا حق استرداد (Veto) بے دھڑک استعمال کرتا ہے۔ اور اگر تجویز منظور بھی ہو جائے تو کون اس کی پروا کرتا ہے، امریکہ کا سایہ اسرائیل کے سر پر ہے۔ عراق پر حملہ کرنا ہو تو اقوام متحدہ کچھ بھی کہتی رہے، امریکہ اور اس کے ہم نوا من مانی کر گزرتے ہیں اور دنیا ٹک ٹک دیکھتی رہتی ہے۔

اقبال کی یہ نظم پہلی بار مجھے میرے والد نے پڑھائی تھی۔ آج اس بات کو سات دہائیاں گزر چکی ہیں لیکن مغربی استعمار کے بارے میں جو کچھ میری فہم ہے اس کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔ مغربی استعمار کا براہ راست تجربہ مجھے 1942 میں ہوا تھا جب 'ہندوستان چھوڑو' (Quit India) کی تحریک میں حصہ لینے والوں کے گھروں کو انگریز حکومت نے دھڑا دھڑ جلا کر خاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ نہ کوئی مقدمہ، نہ جرح، نہ عدالت، بس گھر کے گھر نذر آتش ہو رہے تھے اور ان کے مکین بے بس دیکھ رہے تھے۔ اس وقت یہ باتیں میرے لیے اندوہ ناک اگرچہ سنسنی خیز واقعے تھیں، لیکن ان کے پیچھے سیاست کیا ہے اور کیوں ہے، یہ مجھے اقبال ہی نے بتایا لیکن سیاسی پروپیگنڈے یا تبلیغ و تلقین کے ذریعے نہیں۔ اس نظم کی طباعی، کاٹ کی تیزی اور بین الاقوامی سیاست کے مکمل شعور اور اس کی چالبازیوں کے لیے گہرے جذبۂ حقارت نے اس نظم کو وہ قوت دے دی ہے کہ یہ فوراً دل اور دماغ میں اتر جاتی ہے۔

اقبال کا سب سے بڑا کمال میری نظر میں یہی ہے کہ وہ شاعر کے منصب کو پوری طرح نبھاتے ہیں۔ ترقی پسند شعرا اس باب میں ان کی تقلید کرنے سے ناکام رہے یا وہ اس کام کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے۔ اقبال کے سوا کوئی شاعر مجھے پوری بیسویں صدی میں ایسا نظر نہیں آتا جو ڈبلیو بی ییٹس (W.B. Yeats) کی طرح سیاسی موضوعات کو شاعری میں بدل دیتا ہو۔ لیکن یہ محض اتفاق ہے کہ اس وقت جو نظم یہاں زیر بحث آگئی ہے وہ سیاسی شاعری کے شاہکاروں میں شمار ہونے کے لائق ہے ورنہ اقبال کے یہاں ایسی نظمیں بہت ہیں جن سے ہم شعری سطح پر لطف اندوز ہوتے ہیں اور اکثر تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے سیاسی خیالات ہمیں متاثر نہیں کرتے، لیکن نظم پھر بھی کامیاب رہتی ہے۔ 'بال جبریل' کی نظم 'فرمان خدا (فرشتوں سے)' اس کی مثال ہے۔ اس میں خیالات معمولی اور سرسری ہیں، لیکن نظم پھر بھی قوت اور لطف سے خالی نہیں۔ اگر سیاسی مضمون پر انتہائی کامیاب اور خیال کی سطح پر بے حد بلند نظم کی مثال دیکھنی ہو تو 'لینن خدا کے حضور میں' ملاحظہ کریں۔ اس نظم میں ایک بڑی بات تو یہ بھی ہے کہ اقبال کے آسمانی اور ہمہ گیر تخیل نے حسب معمول دو دنیاؤں کو یکجا کر کے ڈرامائی مکالمے کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ دنیاوی، سیاسی، احتجاجی باتوں کو شعر کے قالب میں یوں ڈھالتے ہیں کہ شعر کا اثر پہلے ہو اور غیر شعری باتوں (یعنی شعر کے دنیاوی معانی) کا اثر بعد میں۔

اقبال کے فارسی کلام سے میری واقفیت اردو کلام کے بہت بعد ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے۔ فارسی میں نے بہت بعد میں پڑھی، اور وہ بھی زیادہ تر اپنے شوق سے پڑھی۔ لیکن ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں نے 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' کا ذکر پہلے سنا، 'زبور عجم' اور 'جاوید نامہ' کا بعد میں۔ اقبال کی فارسی شاعری ان کو شاعر سے زیادہ 'فلسفی' ثابت کرنے کے لیے زیادہ استعمال کی گئی ہے اور میں شاعری کو فلسفہ یا تاریخ یا سیاست سے بڑی حد تک مختلف اور برتر سمجھتا چلا آرہا تھا، لہٰذا میں نے 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' کی طرف شروع شروع میں توجہ نہ کی۔ مدتوں بعد جب فارسی کا ذوق مجھ میں اچھی طرح سرایت کر چکا تھا تب میں نے اقبال کا فارسی کلام پڑھا اور اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی کہ شاعرانہ کمال کے اظہار کی حیثیت سے اقبال کے فارسی کلام اور اردو کلام میں کوئی فرق نہیں، بجز اس کے کہ ان کے فارسی کلام میں ایسے بھی اسالیب ملتے ہیں (مثلاً 'زبور عجم' میں) جو ان کی اردو شاعری میں نہیں ہیں۔ لیکن اقبال کی اردو شاعری سے میری محبت جو روز اول سے قائم ہوئی تھی، فارسی نے اس میں کمی نہ پیدا کی۔ اقبال کی اردو شاعری سے میرا عشق اب ساٹھ برس سے زیادہ پرانا ہے اور اب اس میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اقبال کے بارے میں انگریزی، اردو میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی فارسی شاعری کا ذکر خال خال ہی آپ کو نظر آئے گا۔ ممکن ہے آئندہ بھی اس کوتاہی کی تلافی ہو سکے۔

اقبال کی فارسی شاعری کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے، اقبال ان سے مستغنی اور بالاتر ہیں۔ میں کلیم الدین احمد کی اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کرتا کہ اقبال بڑے شاعر نہیں ہیں کیوں کہ دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں اقبال کا ذکر نہیں ہوتا۔ اس حساب سے تو اقبال ہی کیا، کسی بھی عربی، فارسی، سنسکرت، چینی، جاپانی ادیب کو دنیا کے بڑے ادیبوں کی فہرست میں نہیں شامل کیا جا سکتا۔ اب رہا فی نفسہ الزام تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی قدر و قیمت مشکوک ہے۔ جب دنیا کے بڑے علمی اور تعلیمی ادارے مشرقی ممالک میں ہیں ہی نہیں اور جو ہیں بھی تو وہ مغربی ہی نقطۂ نظر کے حامل ہیں، تو یہ استدلال بے کار اور بے معنی ہے کہ ان اداروں میں اقبال کا ذکر نہیں، لہٰذا اقبال بڑے شاعر نہیں ہیں۔ کسی شاعر کی بڑائی سب سے پہلے خود اس کی اپنی ادبی تہذیب کے معیاروں پر جانچی جاتی ہے، پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ غیر تہذیبوں میں جن لوگوں کو بڑا شاعر کہا جاتا ہے ان کے تناظر میں ہمارے شاعر کو کہاں رکھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں معاییر کے حساب سے اقبال بڑے شاعر ٹھہرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی دھیان میں رکھیے کہ دنیا میں چند ہی مصنف ایسے ہیں جنھوں نے دو زبانوں میں یکساں اعلا مرتبے کا تخلیقی کام کیا ہو۔ ہمارے زمانے میں سیموئل بیکیٹ (Samuel Becket) گزشتہ صدی کے شروع میں اقبال اور ٹیگور، انیسویں صدی میں غالب، یہی چند نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن اقبال نے کئی ادبی تہذیبوں اور فکر انسانی کے کئی علاقوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میری تہذیبی شناخت میں بنگال، اسلام اور انگریزی ادب، یہ تینوں یکساں حصہ دار ہیں۔ اقبال کی تہذیبی شناخت میں سنسکرت، فارسی، عربی، جرمنی اور عمومی طور پر انگریزی کی ادبی اور فکری روایات شامل ہیں۔ اردو اور پنجابی ان پر مستزاد ہیں۔ پھر علوم کو لیجیے تو فلسفہ، الٰہیات، تصوف، قانون، ادب، اقتصادیات، سیاسیات، یہ سب اقبال کے قبضے میں ہیں۔ ایسے شاعر کی فکری توانائی اور ادیبانہ تونگری کا بھلا کچھ ٹھکانہ ہوگا؟

(ماخوذ از دیباچہ 'خورشید کا سامان سفر' 2012)

بقیہ: مولانا ابوالکلام آزاد...

صفحہ ۸ سے آگے

علمی اداروں کی بقا کی ضمانت، ان کی حیات دوام اور ان کے تحفظ کے مستقل اہتمام سے عبارت تھیں۔ ملک کے طول و عرض میں قائم دینی مدارس بشمول دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد، رضا لائبریری رام پور، خدا بخش لائبریری پٹنہ، کتب خانہ ٹونک اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے علاوہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی بقا، نشو و نما، فروغ اور پائیدار تحفظ کے لیے بڑے منصوبہ بند، دانش ورانہ اور دور رس نتائج کے حامل اقدام کیے، جن کی تفصیل قدرے اختصار کے ساتھ یہاں پیش ہے۔

علی گڑھ اور مولانا آزاد کا رشتہ

عجیب و غریب نوعیت کا رہا۔ اپنی ذہنی نشو و نما کے ارتقائی دور میں آزاد، سرسید کی فکر اور ان کی تحریروں سے از حد متاثر تھے۔ لیکن بعد میں انھیں سرسید سے اختلاف ہو گیا اور وہ سرسید کے سیاسی مسلک کے ناقد ہو گئے۔ لیکن یہ سرسید کی رحلت کے بعد کی بات ہے۔ اس کے بعد جب بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مہم شروع ہوئی تو مولانا آزاد اگرچہ اس کے قیام کے حامی تھے، انھوں نے اس کی جدوجہد میں عملی حصہ بھی لیا، لیکن جس شکل میں یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، وہ انھیں قبول نہ تھی۔ پھر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ علی گڑھ سے دور ہوتے گئے۔ یہ تمام امور تفصیلی گفتگو کے متقاضی ہیں لیکن فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں۔ بہ ہر حال بالاختصار یہ کہنا لازم ہے کہ جب تقسیم وطن اور حصول آزادی کے بعد دیگر تمام مسلم اداروں کی طرح مسلم یونیورسٹی کی بقا اور اس کے وجود کو بھی شدید خطرات لاحق ہوئے، تب مولانا آزاد نے اپنے تمام تر فکری اختلاف اور ماضی کی بدمزگیوں کے باوجود اس دانش گاہ کی سرپرستی فرمائی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بھی مسلم یونیورسٹی کے حامیوں میں نہ تھے، لیکن مولانا آزاد نے انھیں بہ اصرار بلکہ ذاتی دباؤ کے تحت علی گڑھ بھیجا تاکہ وہ اس دانش گاہ علمی کو حیات تازہ بخش کر سرسید کی وراثت کو باقی رکھیں، اس کی حفاظت کریں اور اس علمی درس گاہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں، اور یقیناً یہی ہوا بھی۔ اس طرح در اصل مولانا نے مسلم یونیورسٹی کی بقائے دوام کا اہتمام، بڑی دانش مندی اور کمال تدبر کے ساتھ کیا تھا۔ جب ۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد اس دانش گاہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تو تمام شکوؤں اور شکایتوں کو فراموش کر کے طلبہ کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"سرسید نے علی گڑھ میں ایک کالج ہی قائم نہیں کیا بلکہ وقت کے جدید تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اسے دانش وری اور ثقافت کا مرکز بنایا۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا دور تھا اور علی گڑھ اس کا سب سے بڑا مرکز... مستقبل کے مورخ علی گڑھ میں جدید ہندوستان کی تعمیر کے ماخذ تلاش کریں گے... جو دروازے مقفل تھے اب کھل گئے ہیں"۔ (بحوالہ مجلہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، جلد ۱۶، شمارہ ۲۱)

راقم الحروف کو یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں مولانا آزاد جیسا ذی فہم اور بااثر قائد حکومت وقت کا بااختیار رکن رکین نہ ہوتا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وجود یا تو خدانخواستہ باقی نہ ہوتا، یا اس شکل و

صورت میں نہ ہوتا، جس میں آج ہے۔ وقت کے ساتھ نہ صرف اس کی نشو ونما ہوئی ہے بلکہ اس کے حسن و جمال میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ان اذکار کے ثبوت کی ضرورت یوں نہیں کہ اس دانش گاہ کی گزشتہ اسّی برس کی تاریخ ان تمام واقعات کی شاہد اور حقائق کی مؤید ہے۔ راقم کی ان معروضات کی توثیق رشید احمد صدیقی کی ان سطور سے بھی ہوتی ہے:

''بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی نے جو رنگ اور رخ اختیار کیا، اس کی قیادت اتنی حرکی، محکم اور ہمہ جہتی نہ تھی کہ جتنا وقت کا تقاضا۔ اس وقت ایک نئے سرسید کی ضرورت تھی۔ میرے نزدیک یہ رول مولانا ابوالکلام آزاد نے ادا کیا''۔

(بحوالہ 'مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم'، علی گڑھ میگزین، ۱۹۵۹ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بھی مولانا آزاد کی رہین احسان ہے، وہ کہ از بانیان جامعہ تھے، روز اول سے انھوں نے اس ادارے کی رہبری و سرپرستی کی۔ تقسیم ہند کے وقت جامعہ قرول باغ، دہلی میں تھی، وہاں اس کے وجود کو خطرہ لاحق ہوا تو مولانا کی سرپرستی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں جامعہ اوکھلا کی بستی میں منتقل کی گئی، جہاں آج وہ ایک ذی شان دانشگاہ کی شکل میں قائم اور روبہ عروج ہے۔ مولانا کے ہی ایما پر جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا گیا۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام بھی مولانا ہی کے ذہن کی اختراع ہے۔ انھوں نے جامعہ کے بنیادی نام نیشنل مسلم یونیورسٹی کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کردیا اور پھر یہی نام رائج ہوگیا۔ اس کا حوالہ سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف ''حیات شبلی'' میں دیا ہے۔

آزادی کے بعد دارالمصنفین اعظم گڑھ پر بیبری وقت پڑا تو اس کا قائم رہنا بھی دشوار نظر آنے لگا۔ اس وقت مولانا آزاد مسیحا بن کر سامنے آئے۔ انھوں نے سرکاری سطح پر ایک خطیر رقم اس ادارے کے لیے منظور فرمائی، ان کے اس فیصلے کو پنڈت نہرو کی مکمل حمایت حاصل تھی، اس کے باوجود انھیں اس سلسلے میں قومی پارلیمان میں جواب دہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجلّہ 'معارف' کی ایک تحریر اس کی شاہد ہے:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے فی الحال ایک سال کے لیے ساٹھ ہزار کی گراں قدر رقم بطور امداد منظور فرمائی ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی پوری تائید کی ہے''۔

(بحوالہ معارف، اگست ۱۹۵۳ء)

اسی طرح جب مسلم دشمن اور اردو مخالف عناصر کی ریشہ دوانیوں کے سبب دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد کا وجود ہی ناپید ہونے والا تھا تو مولانا نے بروقت اس کی داد رسی کی۔ اس کی شہادت مولانا عبدالماجد دریابادی نے فراہم کی، ان کے الفاظ میں:

''یاروں نے کیا کوئی کسر ادارے کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی تھی، ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کررہا ہے، فرقہ وارانہ ہے، سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام۔ اسے فوراً ختم ہونا چاہیے۔ قریب تھا کہ فرمان قضا اس مضمون کا شائع ہوجائے، لیکن خدا غریق رحمت کرے وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام آزاد کو کہ ان کی مسیحا نفسی نے اسے از سرِ نو زندگی عطا کی''۔

(بحوالہ اردو کا ادیب اعظم، مرتبہ کیف، حصہ چہارم)

درحقیقت مذکورہ بالا تمام ادارے مولانا آزاد کے بروقت دوراندیشانہ اقدام کے طفیل نہ صرف برقرار رہے بلکہ اب بھی قائم اور فروغ پذیر ہیں۔ مولانا آزاد کے ذریعے مذکورہ بالا اداروں کی امداد اور سرپرستی کا ذکر ابوسلمان شاہجہانپوری نے اپنی تصنیف ''اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ'' میں تفصیل سے فرمایا ہے، ان کا ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

''حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ تمام اقدامات وسائل علوم وفنون سے ان کی دلی وابستگی کے عناوین اور اردو کی ترقی کے لیے بنیادی سروسامان کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

(اشاعت اول، بزم انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۹ء)

یہ تمام امور مدلل، مفصل اور با ثبوت گفتگو کے متقاضی ہیں لیکن اس مضمون کا اختصار راقم کو پابند کرتا ہے کہ وہ صرف اشاروں پر اکتفا کرے۔ بہرکیف جامع ثبوت کے طور پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ایک تقریر کا حوالہ دینا لازم ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا:

''مولانا آزاد نے آزادی کے بعد نہایت ناسازگار حالات میں بھی بھارت میں مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور بہادری کے ساتھ کی''۔

(بحوالہ تقریر مولانا سعید احمد اکبرآبادی، کراچی، ۱۹۸۱ء، مطبوعہ اخبارات کراچی)

مسلمانوں کے جن اداروں کا ذکر مندرجہ بالا عبارتوں میں کیا گیا، ان کی سرپرستی و خدمت دراصل اردو کی ہی خدمت تھی کہ انہی اداروں کے دم سے آج اردو زندہ و تابندہ ہے۔ اگرچہ کئی خواب ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے ہیں، تاہم امکانات کسی نہ کسی حد تک روشن ضرور ہیں۔

راقم الحروف کو حیرت صرف اس امر پر ہے کہ مولانا جیسے قد آور مفکر، عالم اور ملکی سیاست کے شہسوار نے نہ کوئی ذاتی تعلیمی نظریہ پیش کیا، جو انھیں ماہر تعلیم کے منصب پر فائز کرتا (یہاں مہاتما گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں) اور نہ ہی سرسید، شیخ عبداللہ (علی گڑھ)، مولانا محمد علی جوہر اور حکیم عبدالحمید کی طرح کوئی دانش گاہ یا درسگاہ ہی قائم کی جب کہ یہ ان کے لیے نہ صرف ممکن الحصول تھا، بلکہ سہل الحصول بھی تھا، اگرچہ مسلم یونیورسٹی سمیت متعدد تعلیمی اداروں کے دفاع و تحفظ کے لیے وہ میدان میں آئے اور کامیابی کے تمغے سر کیے نیز وہ جامعہ کی تاسیس میں سرگرم طور پر شریک تھے، تاہم ان کی دراز قدی، نیز ان کا اخلاص، معاشرتی و سیاسی مقام اس امر کا متقاضی تھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسا کوئی عظیم ادارہ قائم کرتے، جو تاقیامت ان کی یادگار ذی شان ثابت ہوتا۔ غالباً ان کی عملی (سیاسی) قومی جدوجہد نے انھیں اس کی مہلت نہیں دی۔ یوں بھی آزاد ہندوستان کی فضا میں انھیں محض گیارہ برس کا عرصہ ہی میسر ہوا۔ عمر اور حالات یاوری کرتے تو شاید ان کا مطلوبہ بالا کارنامہ بھی منصۂ شہود پر نمودار ہوتا۔ بہرکیف جو کچھ انھوں نے کر دکھایا، وہ بھی کم نہیں بلکہ بہت ہے اور بہتوں کے کارناموں پر بھاری۔ جو صدیوں میں ہوتا ہے، وہ انھوں نے عشروں میں کر دکھایا تھا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم، قائم و دائم ہے اور رہے گی۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں

•••

یوم پیدائش ۱۱/نومبر کے موقع پر خراج عقیدت

مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیمی خدمات

ڈاکٹر مظفر حسین سیّد (29/11، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

ہمارے وطن ہندوستان، جنت نشان کی عموماً اور ہماری محبوب زبان اردو کی بھی خوش بختی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ انھوں نے قومی تعلیم اور اس کی بقا کے لیے بڑی خاموشی اور حسن تدبر کے ساتھ ایسے دور رس اور دیرپا اقدام کیے جن کے ثمرات آج بھی جاری وساری ہیں۔

قومی تعلیم کے میدان میں مولانا نے اول اول ایک حقیقی تعلیمی منصوبہ تیار کیا جس کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کی قومی تعلیم کی عمارت تعمیر ہوئی۔ انھوں نے تعلیم کے تمام شعبہ جات کے لیے منفرد و ممتاز منصوبے وضع کیے، نئے اصول وضوابط تشکیل کیے اور انھیں نافذ بھی کیا، مولانا نے اپنے تعلیمی تصورات کے مطابق — جو در اصل انتہائی مفید تھے، کہ عوام کے عین مفاد میں تھے — تعلیم کی وجہ بندی کے تحت ابتدائی، ثانوی اور اعلا تعلیم کے لیے علاحدہ علاحدہ منصوبے تشکیل دیے جن کی اساس پر آج ہماری قومی تعلیم کا محل ایستادہ ہے، یہی نہیں انھوں نے اعلا تعلیم کے بعد تحقیق نیز مابعد تحقیق جستجو کے علم و دانش کے لیے بھی نئی جہتیں تلاش کیں، اس ذیل میں انھوں نے جدید علوم یعنی سائنس کی ترویج پر بخصوص توجہ مرکوز فرمائی۔ علاوہ ازیں ایک بنیادی حقیقت کے اعتراف کے طور پر مولانا کا تمام تر اصرار ابتدائی سطح کی تعلیم پر تھا کیوں کہ انھیں یقین کامل تھا کہ اگر ابتدائی تعلیم مستحکم بنیادوں پر استوار ہوگی تو آئندہ کے تعلیمی مراحل بھی کامیابی سے طے ہوں گے۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ ابتدائی تعلیم لازماً بچے کی مادری زبان میں ہونی چاہیے، اس لیے کہ دنیاوی امور کی فہم صرف مادری زبان میں بہتر طور پر ممکن ہے۔ اس کے ہمرشتہ انھوں نے انگریزی کی تعلیم پر نہ صرف زور دیا بلکہ اسے نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، در اصل وہ انگریزی زبان کی بین الاقوامیت نیز اس کے دامن میں سمائے ہوئے علوم کی آفاقی حیثیت واہمیت سے کماحقہٗ واقف تھے۔ انھیں یہ بخوبی اندازہ تھا کہ آئندہ عشروں میں نیز اگلی صدی میں انگریزی سے واقفیت ایک بنیادی ضرورت کے طور پر سامنے آئے گی۔ حالات شاہد ہیں کہ بعینہ وہی ہوا، جس کا تصور مولانا نے کیا تھا۔

قابل ذکر ہے کہ آج جدید ہندوستان کے تقریباً تمام موثر تعلیمی ستون مولانا آزاد کے ہی تشکیل کردہ یا تعمیر کردہ ہیں یا پھر ان کی بتدریج ترقی ان کی کاوشوں اور سرپرستی کی رہین منت ہے خواہ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو۔ جی۔ سی) ہو یا دیگر ثقافتی، تہذیبی، ادبی و سائنسی ادارے، یہ تمام تر مولانا کے ذہن رسا کی پیداوار ہیں اور آج ان کی بیش قیمت وراثت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (در اصل بطور وزیر تعلیم مولانا آزاد کی خدمات ایک علاحدہ مستقل مضمون کی متقاضی ہیں، لہٰذا سردست محض اجمالی تذکرہ۔)

انجمن ترقی اردو (ہند) سے مولانا آزاد کی وابستگی، ذاتی اور جذباتی نوعیت کی تھی، ۱۹۰۳ء میں انجمن کے قیام کے دن سے اپنے وقت آخر تک وہ اس تنظیم سے مستقلاً وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے اخبار لسان الصدق کو عملاً انجمن کا ترجمان بنا دیا تھا، اس کے بعد بھی وہ مسلسل اس ادارے کی سرپرستی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد جب انجمن کس مپرسی و غیر یقینی حالات کا شکار ہوئی تو مولانا نے نہ صرف وزارت تعلیم سے اس کی عمارت کے لیے ایک خطیر رقم منظور فرمائی بلکہ اس کی مستقل سالانہ امداد کا اہتمام بھی کروایا۔ انھوں نے ذاتی دلچسپی لے کر اور کڑی نگرانی کرا کے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو انجمن کی جملہ املاک نیز کتابوں کا ذخیرہ پاکستان منتقل کرنے سے باز رکھا اور اس کا صدر دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل کروا دیا، پھر انجمن کے پرچم تلے کل ہند اردو کانفرنس منعقد کرائی۔

مولانا آزاد نے اردو کے مقدمے کو بڑے ہی پر زور، موثر اور مدلل طریقے سے ۱۵؍فروری ۱۹۵۸ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام انعقاد پذیر کل ہند اردو کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ اپنی وفات سے محض ایک ہفتہ قبل مولانا نے اس اجلاس میں بڑی وقیع و بسیط تقریر ارشاد فرمائی تھی، جو اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کا مکمل متن شامل عبارت کیا جائے، تاہم بہ لحاظ اختصار اس کی صرف چند سطریں حاضر ہیں۔

"تیس چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اردو کے حامی تھے، وہ چاہتے تھے کہ اردو ملک کی زبان ہو۔ اور جو ہندی کے حامی تھے، ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو اور یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا، کیوں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ ملک آزاد ہوا، دستور بنا، اسمبلی میں بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کرلیا گیا، جس کے نتیجے میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا۔ لیکن اردو کی جو جگہ ہے اسے ملنی چاہیے۔"
(مولانا آزاد کی تقریریں، مرتبہ عارف انور، ۱۹۶۱ء)

اس کانفرنس میں مولانا آزاد نے اردو کا پرجوش و پرزور دفاع کیا، اس کی مدلل وکالت کی اور اسی اجلاس میں پنڈت نہرو سے اردو کی حمایت کا واضح اقرار و اعلان بھی کروایا۔ پنڈت نہرو نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔ شومیٔ قسمت کہ اردو کی یہ کانفرنس مولانا کی حیات کا آخری اجتماع ثابت ہوئی، جس میں انھوں نے اردو کا مقدمہ پیش کیا تھا۔

در اصل آزادی کے بعد مولانا آزاد نے اردو کے حق کی جنگ از سر نو شروع کی تھی۔ انھوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہندی کے منصب و مرتبے پر حرف نہ لاتے ہوئے اردو کے جائز حق کا مطالبہ کیا جائے اور اس کو اس کا وہ مقام دلایا جائے جس کی وہ سزاوار ہے، اخلاقی طور پر بھی اور قانونی طور پر بھی۔

بہ حیثیت ایک ملکی، معاشرتی و استعمالی زبان کے، اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے مولانا آزاد کی خدمات بنیادی نوعیت کی ہیں اور تاریخی اہمیت کی حامل۔ در اصل وہ اس راز سے واقف تھے کہ اگر آزاد ہندوستان میں روزگار کے ساتھ اردو کا دیرینہ رشتہ برقرار نہ رہا تو اس کی بقا و زیست کی ضمانت نہ دی جاسکے گی، اس لیے انھوں نے ایسے عملی اقدام کیے کہ اردو کی تدریس رائج الوقت نظام تعلیم کا جزو لازم بن جائے۔

اولین وزیر تعلیم کی حیثیت سے جب انھوں نے ایک جدید نظام تعلیم کا خاکہ مرتب کیا تو اردو کا التزام رکھا۔ انھوں نے سرکاری تعلیمی اداروں میں اردو تعلیم کی گنجائش نکالنے کے لیے سہ لسانی فارمولے کی تجویز پیش کی اور ہندی و انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کے طور پر اردو کو اس کا حصہ بنایا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کم از کم شمالی ہند، جہاں ہندی کے علاوہ کوئی علاقائی زبان نہ تھی، اور بالخصوص اتر پردیش اور بہار میں، جو کبھی اردو کے مرکز تھے، وہاں اردو کی تعلیم صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے لازم و ملزوم بن جائے۔ در اصل یہ ایک طویل مدتی منصوبہ تھا اور مولانا کی فراست و معاملہ فہمی کا ایک اعلا و ارفع ثبوت، جس کے کلی وافادی نتائج چند برسوں بعد سامنے آتے اور وقت کے ساتھ مستقل ہوجاتے، مگر افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی، اور ان کے جانشینوں نے اس طرف چنداں توجہ نہ کی۔ سہ لسانی فارمولا آج بھی موجود ہے مگر اس کے توسط سے اردو کو برائے نام ہی فیض حاصل ہو رہا ہے، کیوں کہ تیسری زبان کے نام پر سنسکرت کو مسلط کردیا گیا ہے۔ اس طرح مولانا کی منصوبہ بندی و دوربینی کا بنیادی مقصد ہی فوت ہوگیا، اور ان کا خواب نامکمل رہ گیا۔ بقول امیر شکست و فتح تو نصیبوں سے ہوتی ہے مگر جہد مسلسل اور اخلاص نیت شرط ہے، اور مولانا سے اس باب میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ اردو کے تئیں مولانا آزاد کی خدمات عالیہ سے انکار کفر ہے۔ اردو کے تعلق سے مولانا کی عظمت اور ان کی حکمت کو سلام۔

اردو کی ترویج و ترقی کے لیے مولانا آزاد کی مساعی جلیلہ بڑی حد تک

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مدیر: اطہر فاروقی — Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں — Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — Printer, Publisher: Shahid Khan
مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Proprietor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 2/-, Yearly: 85/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http://www.atuh.org. Phones: 23237212, 23237214